يَآ اَيُّهَا الرَّسُوْلُ بَلِّغْ مَآ اُنْزِلَ اِلَيْكَ مِنْ رَّبِّكَ (5:67)

اے رسولؐ! اِس ضابطۂ حیات کو جو تمہارے ربّ کی طرف سے تُم پر نازل کیا گیا ہے
تمام اِنسانوں تک پہنچا دو۔

قرآنِ کریم کی رُو سے

علماء کون ہیں؟

پرویز

ادارہ طلوعِ اسلام
25 بی، گلبرگ 2، لاہور فون: 042-35714546
Email: idara@toluislam.com
Web: www.toluislam.com

قرآنی حقائق کو سمجھنے کے لئے
ماھنامہ
طلوعِ اسلام
خود پڑھیئے،
دُوسروں کو پڑھنے کے لیے پیش کیجئے
یہ
ایک ماہنامہ ہی نہیں بلکہ ایک زندہ اور زندگی بخش تحریک ہے جس کا مقصد قرآنی فِکر کو اس طرح عام کرنا ہے کہ وہ نوجوانوں کے دِل کی گہرائیوں میں اُتر جائے اور وہاں سے
صحیح آسمانی اِنقلاب بن کر اُبھرے!

سالانہ زرشرکت اندرون ملک -/300 روپے۔ بیرون ملک -/2000 روپے
رقم بذریعہ منی آرڈر۔ بینک ڈرافٹ
بنام ادارہ طلوع اسلام 25-B گلبرگ 2' لاہور ارسال فرمائیں۔
بینک اکاؤنٹ نمبر 7-3082 برانچ کوڈ 0465
نیشنل بنک آف پاکستان۔ مین مارکیٹ گلبرگ' لاہور۔

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

سلیم کے نام ایک خط

عُلَماء کون ھیں؟

اس میں کوئی شبہ نہیں سلیم! کہ علم وجہٗ شرفِ انسانیت ہے لیکن سوال یہ ہے کہ علم کہتے کسے ہیں اور علماء کون ہیں؟ قرآن نے اس سوال کا جواب بڑا جامع اور مفصل دیا ہے لیکن اس تک پہنچنے سے پہلے چند الفاظ تمہیداً ضروری ہیں' انہیں غور سے سننا۔

علم کی دنیا میں حکمائے یونان کا جو مقام ہے اس سے تم واقف ہو۔ حقیقت یہ ہے کہ اس وقت تک انسانیت کی جس قدر تاریخ ہمارے سامنے آچکی ہے اس میں علم وحکمت کی داستان کا آغاز ہی درس گاہ یونان سے ہوتا ہے۔ ان میں سقراط (Socrates) کو ابوالآباء اور افلاطون (Plato) کو اس کے بہترین شارح' اور بجائے خویش ایک مکتب فکر کے موسس کی حیثیت حاصل ہے۔ لیکن سقراط صرف انسان کو قابل مطالعہ سمجھتا ہے کائنات کو نہیں اور افلاطون عالم محسوس کے

وجود ہی پر خطِ تنسیخ کھینچ دیتا ہے۔ اس کا خیال ہے کہ یہ کائنات جو ہمیں اس طرح محسوس (Concrete) دکھائی دیتی ہے' اپنا وجود ہی نہیں رکھتی۔ اصلی اور حقیقی کائنات عالم مثال (World of Ideas) میں ہے اور یہ مرئی (Visible) کائنات اس حقیقی دنیا کا عکس ہے۔ لہٰذا اس کائنات کے متعلق جو علم حواس (Senses) کے ذریعے حاصل کیا جائے یعنی (Perceptual Knowledge) وہ قابل اعتماد ہی نہیں۔ یقینی علم وہ ہے جو آنکھیں اور کان بند کر کے عالم تصور میں حاصل کیا جائے۔

تصوف

افلاطون کا یہی فلسفہ ہے جس پر یونانی تصوف کی عمارت' استوار ہوئی۔ اسی نے ہندوستان میں پہنچ کر ویدانت کی شکل اختیار کی۔ چنانچہ ہندو فلسفہ کی رو سے پراکرتی (مادی دنیا) مایا (فریب) ہے یہ سب برہما کا سپنا (خدا کا خواب) ہے۔ یہ ایشور کی لیلا ہے۔ یعنی ناٹک کا کھیل جس میں کوئی شے حقیقی نہیں ہوتی بلکہ حقیقت کی تمثیل ہوتی ہے۔ نہ بادشاہ' بادشاہ ہوتا ہے نہ غلام' غلام۔ نہ دریا' دریا ہوتا ہے' نہ پہاڑ' پہاڑ۔ یہ سب فریبِ نگاہ ہوتا ہے۔ اسی بناء پر ہندو فلسفہ میں خدا کو نٹ راجن کہا جاتا ہے۔ یعنی نٹوں (ایکٹروں' کھلاڑیوں) کا بادشاہ! اس مقام پر ضمناً یہ بھی سمجھ لو سلیم! کہ کائنات کو اس طرح باطل قرار دینے کا نتیجہ تھا کہ اس کی طرف سے انسان کے دل میں منفی اسلوب (Negative Attitude) پیدا ہو جائے۔ یہی منفیانہ اندازِ نگاہ تھا جس نے ''خدا پرست'' انسانوں کی نگاہ میں دنیا کو قابل نفرت بنا دیا۔ یہی فلسفہ ہے جو ایرانی تصوف کے راستے مسلمانوں میں بھی آ گیا اور ان کی زندگی کے ہر گوشے کو متاثر (اور مسموم) کر گیا۔ ہمارے تصوف کی ساری عمارت اسی بنیاد پر قائم ہے اور ہماری شاعری چونکہ اسی تصوف کی نقیب ہے اس لئے ہمیں بھی قدم قدم پر اس قسم کی آوازیں سنائی دیتی ہیں۔ کبھی سقراط کے اتباع میں یہ کہا جاتا ہے کہ

ستم است گر ہوست کشد کہ بہ سیر سرو وسمن درا
توز غنچہ کم نہ دمیدۂ درِ دِل کشا بہ چمن درا

(بیدلؔ)

(ستم ہے اگر تمہارے دل میں سرو کے پیڑوں اور سمن کے پھولوں کو دیکھنے کی خواہش ہے۔تم خود ایک غنچے سے کم کھلے ہوئے نہیں ہو' باہر جانے کی بجائے اپنے دِل کا دروازہ کھولو اور چمن میں پہنچ جاؤ۔ (ترجمہ از سلیم)

اور کبھی افلاطون کے تتبع میں یہ کہ

ہستی کے مت فریب میں آجائیو اسدؔ
عالم تمام حلقۂ دامِ خیال ہے

اور اسی سے ہمارے ہاں بھی دنیا قابل نفرت سمجھی جانے لگی (یہ الگ موضوع ہے جس کے متعلق میں بہت کچھ لکھ چکا ہوں)۔

قرآن کا چیلنج

بہر حال سلیم! میں کہہ یہ رہا تھا کہ قرآن سے پہلے کائنات سے متعلق نظریہ یہ تھا کہ اس کا حقیقی وجود کچھ نہیں۔ یہ محض فریب تخیل ہے' سراب ہے' سایہ ہے' وہم ہے' گمان ہے اور جب کائنات وہم وفریب ہے تو اس کے متعلق علم بھی درحقیقت علم نہیں' ظن وگمان ہے۔قرآن آیا اور اس نے (ہر باطل تصور کی طرح) افلاطون کے اس طلسم کی بھی دھجیاں بکھیر کر رکھ دیں۔اس نے تصوف اور ویدانت کے نظر فریب تخیلات میں الجھی ہوئی انسانیت کو للکار کر پکارا اور کہا کہ: **وَمَا خَلَقْنَا السَّمَآءَ وَالْاَرْضَ وَمَا بَيْنَهُمَا بَاطِلًا** ۔ کائنات کی پستیوں اور بلندیوں میں جو کچھ ہے۔ہم نے اسے باطل پیدا نہیں کیا۔ **ذٰلِكَ ظَنُّ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا** ۔ یہ ان لوگوں کا ظن وخیال اور وہم وگمان ہے جو حقیقت سے انکار کرتے ہیں۔ **فَوَيْلٌ لِّلَّذِيْنَ كَفَرُوْا مِنَ النَّارِ** (38:27) اور جو لوگ اتنی بڑی حقیقت سے انکار کریں (دنیا کو باطل اور قابل نفرت ٹھہرائیں) تو ان کے اس انکار کا نتیجہ اس کے سوا اور کیا ہو

سکتا ہے کہ ان کی سعی وعمل کی کھیتیاں جھلس کر رہ جائیں۔

تم نے غور کیا سلیم! کہ قرآن نے ایک آیت میں صدیوں کے غلط تصور کو کس طرح جڑ بنیاد سے اکھیڑ کر رکھ دیا اور اس کے انسانیت سوز نتائج کو کس طرح بے نقاب کر دیا ہے! پھر اس پر بھی غور کرو کہ قرآن نے کائنات کو باطل قرار دینے اور اس کی طرف سے منفیانہ تصور رکھنے والوں کو' کافر' کہہ کر پکارا ہے۔تم نے سوچا کہ قرآن کی رو سے کفر اور ایمان کی حدیں کہاں تک چلی جاتی ہیں اور کافر ومومن کے امتیازی خصائص کیا ہیں؟ اور پھر یہ جو کہا کہ اس قسم کے منفیانہ اندازِ نگاہ کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ انسانیت کی مزرع ہستی جل کر راکھ ہو جاتی ہے۔تو یہ کتنی بڑی تاریخی حقیقت کا بیان ہے؟ کائنات کے متعلق منفیانہ اندازِ نگاہ کا مظہر مسلکِ خانقاہیت ہے۔اسی کو ویدانت اور تصوف کہتے ہیں۔تم اس مسلک کی تاریخ پر غور کرو اور دیکھو کہ اس راستہ میں انسانوں نے جس قدر جانکاہ مشقتیں اٹھائیں اور صبر طلب ریاضتیں کی ہیں ان کا نتیجہ اس کے سوا اور کیا نکلا کہ انسان کی عمرانی زندگی کی ہری بھری شاخیں جھلس کر رہ گئیں۔

یہ تو تھا کائنات کو باطل قرار دینے والوں کے خلاف اعلانِ جنگ۔اس کے بعد مثبتانہ انداز میں کہا کہ: **خَلَقَ اللّٰهُ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضَ بِالْحَقِّ** ؕ ۔حقیقت یہ ہے کہ خدا نے اس پست و بلند کائنات کو بالحق پیدا کیا ہے۔ کائنات حقیقت پر مبنی (Real) ہے فریبِ تخیل نہیں۔ یہ یکسر تعمیری مقاصد کے لئے پیدا کی گئی ہے تخریبی نتائج کے لئے نہیں۔ **اِنَّ فِيْ ذٰلِكَ لَاٰيَةً لِّلْمُؤْمِنِيْنَ** (29:44)' اس انکشافِ حقیقت میں جو قرآن نے کیا ہے۔علم و آگہی کی بہت بڑی نشانی ہے ان لوگوں کے لئے جو اس پر یقین رکھتے ہیں۔ دیکھو سلیم! سابقہ آیت میں کائنات کو باطل قرار دینے والوں کو کافر کہا گیا تھا۔زیرِنظر آیت میں اسے حق سمجھنے والوں کو مومن قرار دیا گیا ہے۔دیکھا تم نے سلیم! کہ قرآن کس طرح اپنے مطالب کو خود ہی واضح کرتا چلا جاتا ہے۔

کائنات کو ایشور کی لیلا' قرار دینے والوں کے نظریہ کے ابطال میں کہا کہ: **وَمَا خَلَقْنَا السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضَ وَمَا بَيْنَهُمَا لٰعِبِيْنَ** (44:38) کائنات کی پستیوں اور بلندیوں میں جو کچھ

ہے ہم نے اسے یونہی کھیلتے ہوئے پیدا نہیں کیا۔ تخلیق کائنات ایک نہایت اہم (Serious) پروگرام کا جزو ہے۔ کھیل تماشہ نہیں۔ اسے بِالحق پیدا کیا گیا ہے۔

اب سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ قرآن اپنے اس دعوے کو (کہ کائنات بالحق پیدا کی گئی ہے) یونہی منوانا چاہتا ہے یا علم و برہان کی رو سے تسلیم کرنے کی دعوت دیتا ہے قرآن اپنے ہر دعوے کو علم و برہان کی بنیادوں پر پیش کرتا اور فکر و بصیرت کی رو سے ماننے کی تاکید کرتا ہے۔ چنانچہ اس ضمن میں بھی اس نے واضح الفاظ میں کہہ دیا ہے کہ: **يُفَصِّلُ الْاٰيٰتِ لِقَوْمٍ يَّعْلَمُوْنَ** (10:5) ہم ان حقائق کو ان لوگوں کے لئے کھول کھول کر بیان کرتے ہیں جو علم رکھتے ہیں۔

علم کی قرآنی تعریف

یہاں سے یہ سوال سامنے آتا ہے کہ علم کسے کہتے ہیں؟ سنو سلیم! قرآن اس باب میں کیا کہتا ہے وہ کہتا ہے کہ: **وَلَا تَقْفُ مَا لَيْسَ لَكَ بِهٖ عِلْمٌ**ؕ۔ یاد رکھو کہ جس بات کا تمہیں علم نہ ہو اس کے پیچھے مت لگا کرو۔ آیت کا اتنا حصہ بھی کچھ کم حقیقت کشا اور بصیرت افروز نہیں لیکن اس کے بعد چند الفاظ نے علم کی ایک ایسی تعریف (Definition) دے دی ہے۔ جس سے ساری بات نکھر کر سامنے آجاتی ہے۔ فرمایا: **اِنَّ السَّمْعَ وَالْبَصَرَ وَالْفُؤَادَ كُلُّ اُولٰٓئِكَ كَانَ عَنْهُ مَسْئُوْلًا** (17:36) یہ حقیقت ہے کہ تمہاری سماعت، بصارت اور فواد۔ ہر ایک پر ذمہ داری عائد ہوتی ہے۔ تم نے سمجھا سلیم! کہ بات کیا ہوئی؟ قرآن سمع (سننے) اور بصر (دیکھنے) کو انسانی حواس (Senses) کے معنوں میں استعمال کرتا ہے اور فواد وہ چیز ہے جسے دورِ حاضر کی اصطلاح میں (Mind) کہا جاتا ہے۔ انسانی حواس (سمع و بصر) معلومات (Data) فراہم کر کے انسانی فواد (Mind) تک پہنچاتی ہیں اور فواد ان سے استنباط نتائج کرتا ہے۔ تم کارتوس کی آواز سنتے ہو تو فوراً اس نتیجہ پر پہنچتے ہو کہ کسی نے بندوق چلائی۔ اس کے بعد چیخ کی آواز سنتے ہو تو سمجھ لیتے ہو کہ کسی کے گولی لگ گئی اور باہر جا کر دیکھتے ہو کہ جسے گولی لگی ہے وہ تمہارا دوست ہے تو گولی چلانے

والے کے خلاف تمہارے دل میں آتش انتقام بھڑک اٹھتی ہے۔اس تمام واقعہ میں تمہارے سمع و بصر وفوأد کی شہادت موجود ہے۔لہٰذا یہ علم ہے لیکن اگر تم نہ بندوق کی آواز سنو نہ کسی چیخ کی۔نہ اپنے دوست کو تڑپتا دیکھو۔نہ کسی گولی چلانے والے کو اور یونہی کسی کی بات سن کر ایک شخص کی جان کے لاگو ہو جاؤ تو تمہارا یہ فعل علم پر مبنی نہیں ہوگا کیونکہ اس میں تمہارے سمع و بصر کی شہادت موجود نہیں۔تم نے غور کیا سلیم! کہ قرآن علم کے بارے میں حواس (Sense Perception) کو کس قدر اہمیت دیتا ہے۔یہ دوسری ضرب ہے جو وہ افلاطونی تصور کے خلاف لگاتا ہے اور اسے پاش پاش کر کے رکھ دیتا ہے۔افلاطون نے کہا تھا کہ حواس کے ذریعے حاصل کردہ علم پر اعتماد نہیں کیا جا سکتا۔قرآن نے کہا کہ جس بات کی شہادت سمع و بصر نہ دے وہ علم پر مبنی نہیں لیکن صرف سمع و بصر ہی نہیں بلکہ ان کے ساتھ فوأد بھی۔

سمع و بصر سے کام نہ لینے والے

سمع و بصر وقلب کی اسی اہمیت کے پیش نظر قرآن نے صاف الفاظ میں کہہ دیا کہ جو لوگ ان سے کام نہیں لیتے وہ انسانی سطح پر نہیں بلکہ حیوانی سطح پر زندگی بسر کرتے ہیں۔اتنا ہی نہیں بلکہ وہ انہیں جہنمی قرار دیتا ہے۔سورۂ اعراف میں ہے: **وَلَقَدْ ذَرَاْنَا لِجَهَنَّمَ كَثِيْرًا مِّنَ الْجِنِّ وَالْاِنْسِ**۔ جن و اِنس (شہری اور صحرائی آبادیوں کے) میں اکثر وہ لوگ ہیں جو اس قسم کی زندگی بسر کرتے ہیں جو انہیں سیدھی جہنم کی طرف لے جاتی ہے۔ **لَهُمْ قُلُوْبٌ لَّا يَفْقَهُوْنَ بِهَا**۔ان کی روش یہ ہے کہ وہ سینے میں دل رکھتے ہیں لیکن اس سے سمجھنے کا کام نہیں لیتے۔ **وَلَهُمْ اَعْيُنٌ لَّا يُبْصِرُوْنَ بِهَا**۔وہ آنکھیں رکھتے ہیں لیکن ان سے دیکھنے کا کام نہیں لیتے۔ **وَلَهُمْ اٰذَانٌ لَّا يَسْمَعُوْنَ بِهَا**۔وہ کان رکھتے ہیں لیکن ان سے سننے کا کام نہیں لیتے۔ **اُولٰٓئِكَ كَالْاَنْعَامِ بَلْ هُمْ اَضَلُّ**۔یہ انسان نہیں حیوان ہیں بلکہ ان سے بھی زیادہ گم کردہ راہ۔ **اُولٰٓئِكَ هُمُ الْغٰفِلُوْنَ** (7:179) یہ علم و حقیقت سے بے خبر ہوتے ہیں۔اس سے بھی واضح ہے کہ علم وہی علم ہے جس کی شہادت سمع و بصر وقلب

دے۔ ظاہر ہے کہ اس قسم کا علم نظری مباحث(Theoretical Problems) کے متعلق نہیں ہوسکتا۔ کیونکہ ایسے امور میں سمع و بصر کا کوئی واسطہ ہی نہیں ہوتا۔ سمع و بصر کا تعلق مظاہر فطرت کے مشاہدات اور کائناتی نظام کے مطالعہ سے ہے۔ یعنی کائنات کے ایک ایک گوشے کو غور و فکر سے دیکھنا۔ اس عظیم القدر اور محیر العقول مشینری کے ایک ایک پرزے کا مشاہدہ کرنا۔ پھر مختلف تجربات کی رو سے یہ دیکھنا کہ ان پرزوں کی ساخت و پرداخت میں کون سا قانون اوران کی نقل و حرکت میں کون سی اسکیم کارفرما ہے۔ اسی کو دورِ حاضرہ کی اصطلاح میں علم سائنس (Scientific Knowledge) کہتے ہیں اوراسی کو قرآن مومنین کا شعار بتاتا ہے۔

خدا کا ذکر کرنے والے

غور کرو سلیم! کہ قرآن اس حقیقت کو کس قدر واضح اور حسین انداز میں بیان کرتا ہے۔ سورۂ آل عمران میں ہے: اِنَّ فِیۡ خَلۡقِ السَّمٰوٰتِ وَالۡاَرۡضِ وَاخۡتِلَافِ الَّیۡلِ وَالنَّهَارِ لَاٰيٰتٍ لِّاُولِی الۡاَلۡبَابِ (3:190) یقیناً اس کائنات کی پستیوں اور بلندیوں کی تخلیق اور رات اور دن کی گردش میں صاحبانِ عقل وشعور کے لئے بڑی نشانیاں ہیں۔ کن اربابِ دانش کے لئے؟ الَّذِیۡنَ یَذۡکُرُوۡنَ اللّٰهَ قِیٰمًا وَّقُعُوۡدًا وَّعَلٰی جُنُوۡبِهِمۡ۔ ان کے لئے جو اُٹھتے بیٹھتے۔ لیٹتے ہر وقت قانونِ خداوندی کو اپنے سامنے رکھتے ہیں۔ وَیَتَفَکَّرُوۡنَ فِیۡ خَلۡقِ السَّمٰوٰتِ وَالۡاَرۡضِ ۚ۔ یعنی تخلیق ارض وسما میں غور و فکر کرتے رہتے ہیں اوراپنے مشاہدات وتجارب کے بعد علیٰ وجہ البصیرت اس نتیجہ پر پہنچتے ہیں کہ رَبَّنَا مَا خَلَقۡتَ هٰذَا بَاطِلًا ۚ۔ اے ہمارے نشو ونما دینے والے! تو نے کائنات کی کسی شے کو بیکار یا تخریبی نتائج کے لئے پیدا نہیں کیا۔ غور کیا سلیم! کہ یہ کتنی بڑی بات ہے جو قرآن نے کہی ہے۔ قرآن کا یہ دعویٰ ہے کہ کائنات کی کوئی شے نہ عبث و بیکار ہے اور نہ محض تخریبی نتائج کے لئے وجود میں لائی گئی ہے۔ ہر شے ایک متعین مقصد رکھتی ہے اورنوعِ انسانی کے لئے کسی نہ کسی پہلو سے نفع بخش ہے لیکن قرآن کا یہ مقصد نہیں کہ ہم اس کے دعویٰ کو یونہی مانتے رہیں۔ وہ کہتا ہے کہ تمہارا

فریضہ ہے کہ تم کائنات کی ایک ایک چیز پر غور کرو اور مسلسل مشاہدات اور پیہم تجربات کے بعد ان کے متعلق یہ ثابت کرو کہ رَبَّنَا مَا خَلَقْتَ هٰذَا بَاطِلًا ۚ۔ سوچو سلیم! یہ کتنا بڑا پروگرام ہے جو قرآن نے جماعت مومنین کے سامنے رکھا ہے۔ یہ کتنی عظیم ذمہ داری ہے جو ان پر عائد کی گئی ہے۔ کائنات کی ہر شے کے متعلق عملاً ثابت کرنا کہ وہ فلاں فائدہ کے لئے پیدا کی گئی ہے۔ یہ ہے قرآن ماننے والوں کا فریضہ! غور کرو کہ اس کے لئے کس قدر وسیع اور عمیق سائنٹیفک تحقیقات کی ضرورت ہے۔ اس کے لئے کتنی بڑی بڑی معمل (Laboratories) درکار ہیں۔ تمہیں یاد ہے کہ اگلے دنوں جاوید تم سے پوچھتا تھا کہ ابا جان! اللہ میاں نے بھڑوں کو کاہے کے لئے بنا دیا ہے۔ یہ تو ہر ایک کو کاٹتی پھرتی ہیں اور بھلے چنگے آدمی کا منہ سُجا دیتی ہیں، بالآخر ان سے فائدہ کیا ہے؟ ان کا فائدہ نہ تم بتا سکتے تھے نہ کوئی اور۔ لیکن اگلے دنوں جنوبی امریکہ سے ایک خبر آئی کہ وہاں ایک قسم کا کیڑا پیدا ہوتا ہے جو بعض قیمتی پودوں کو سخت نقصان پہنچاتا ہے۔ اس کا کوئی علاج ان کی سمجھ میں نہیں آ رہا تھا۔ بالآخر مسلسل مشاہدات کے بعد یہ معلوم ہوا کہ ان کیڑوں کو بھڑیں کھا جاتی ہیں۔ اب انہوں نے مختلف گرم ممالک سے بھڑیں جمع کر کے اپنے ملک میں پھیلانا شروع کر دیا ہے۔ یہ ہیں وہ لوگ جو سلیم! علیٰ وجہ البصیرت پورے حتم ویقین سے کہہ سکتے ہیں کہ رَبَّنَا مَا خَلَقْتَ هٰذَا بَاطِلًا ۚ۔ اے کائنات کے نشو ونما دینے والے! تو نے بھڑوں کو بھی تخریبی کاموں کے لئے پیدا نہیں کیا۔ یہ بھی کائنات کی نشو ونما میں تعمیری کام کرتی ہیں سُبْحٰنَكَ یہ تجھ سے بہت بعید ہے کہ کسی شے کو محض تخریب کے لئے پیدا کر دے۔ یہ چیز تیری شانِ ربوبیت سے بہت دور ہے۔ یہ تو ہماری کم علمی اور سائنٹیفک تحقیقات کا فقدان ہے۔ جو ہم ان کے نفع بخش پہلوؤں سے بے خبر، فلھذا ان کی زہر پاشیوں سے جھلستے اور تڑپتے رہتے ہیں۔ ہماری آرزو یہ ہے کہ تو ہمیں ان تحقیقات کی توفیق عطا فرما تا کہ ہم اس قسم کے دردناک عذاب سے محفوظ رہیں۔ فَقِنَا عَذَابَ النَّارِ (3:191) اس لئے کہ جو قومیں اس قسم کی تحقیقات (Researches) سے اشیائے کائنات کے نفع بخش پہلوؤں سے بے خبر رہتی ہیں۔ وہ تسخیر فطرت نہیں کر سکتیں۔ لہٰذا دنیا میں ذلت وخواری کی زندگی بسر کرتی

ہیں۔ رَبَّنَآ اِنَّکَ مَنۡ تُدۡخِلِ النَّارَ فَقَدۡ اَخۡزَیۡتَہٗ ؕ اور پھر ان ظالمین کا دنیا میں کوئی یار ومددگار نہیں ہو گا۔ وَمَا لِلظّٰلِمِیۡنَ مِنۡ اَنۡصَارٍ (3:192) تم نے دیکھا سلیم! قرآن نے اس آیت میں کتنی بڑی حقیقتوں کو بیان کر دیا ہے۔ بہرحال بات یہ ہو رہی تھی کہ قرآن کی رو سے امتِ مسلمہ اور جماعتِ مومنین کا فریضہ یہ ہے کہ وہ کائنات کی ایک ایک چیز کا مشاہدہ کریں اور پیہم تجربات سے ان کے منفعت بخش پہلوؤں کو بے نقاب کرتے جائیں۔ اسی کو قرآن نے ذکر و فکر سے تعبیر کیا ہے یعنی کائناتی قوانین کو اپنے سامنے رکھنا اور ان میں ہر آن غور و تدبیر کرتے رہنا۔ یہی مومنین کا شعار تھا۔

کائنات میں آیات اللہ

اِنَّ فِی السَّمٰوٰتِ وَالۡاَرۡضِ لَاٰیٰتٍ لِّلۡمُؤۡمِنِیۡنَ (45:3) مومنین کے لئے کائنات کے ہر گوشے میں آیاتِ خداوندی بکھری پڑی ہیں۔ انہی سے انسان کو خدا کی خداوندی کا یقین حاصل ہوتا ہے۔ وَفِیۡ خَلۡقِکُمۡ وَمَا یَبُثُّ مِنۡ دَآبَّۃٍ اٰیٰتٌ لِّقَوۡمٍ یُّوۡقِنُوۡنَ (45:4) اور خود تمہاری تخلیق اور دوسرے حیوانات کی افزائش نسل میں ان لوگوں کے لئے نشانیاں ہیں جو قانونِ خداوندی پر پورا پورا یقین رکھتے ہیں۔ وَاخۡتِلَافِ الَّیۡلِ وَالنَّھَارِ وَمَآ اَنۡزَلَ اللّٰہُ مِنَ السَّمَآءِ مِنۡ رِّزۡقٍ فَاَحۡیَا بِہِ الۡاَرۡضَ بَعۡدَ مَوۡتِھَا وَتَصۡرِیۡفِ الرِّیٰحِ اٰیٰتٌ لِّقَوۡمٍ یَّعۡقِلُوۡنَ (45:5) اور رات اور دن کی گردش میں، اور اس بارش میں جو بادلوں سے برستی ہے اور ہر جاندار کے لئے اپنے اندر نشو ونما کا سامان رکھتی ہے اور جو زمین مردہ کو از سرِ نو زندگی عطا کرتی ہے۔ اور ان ہواؤں میں جو مختلف موسموں میں مختلف سمتوں میں چلتی ہیں۔ ان تمام مظاہرِ فطرت میں اس قوم کے لئے نشانیاں ہیں جو عقل وفکر سے کام لیتی ہے۔ ان حقائق کے بیان کرنے کے بعد، قرآن ایک ایسی عظیم حقیقت کو سامنے لاتا ہے۔ جس سے بیک وقت حیرت وبصیرت پیدا ہو جاتی ہے۔ فرمایا: تِلۡکَ اٰیٰتُ اللّٰہِ نَتۡلُوۡھَا عَلَیۡکَ بِالۡحَقِّ ۚ۔ یہ وہ آیات ہیں جنہیں ہم حق کے ساتھ تمہارے سامنے پیش کر رہے ہیں۔ فَبِاَیِّ حَدِیۡثٍ

بَعْدَ اللّٰهِ وَاٰيٰتِهٖ يُؤْمِنُوْنَ (45:6) سو جو لوگ اللہ اور اس کی اس قسم کی آیات پر بھی ایمان نہیں لاتے تو پھر ان کے سامنے اور کون سی حقیقت ایسی آئے گی جس کی رُو سے وہ خدا پر ایمان لائیں گے۔ یعنی اللہ تعالیٰ نے واضح الفاظ میں بتا دیا ہے کہ خدا پر ایمان لانے کے لئے مظاہر قدرت کا مشاہدہ اور اس کے کائناتی قوانین کا مطالعہ کرو۔ اگر کسی کو ان کے ذریعے بھی خدا پر ایمان حاصل نہیں ہوتا تو پھر کوئی اور حقیقت ایسی نہیں رہ جاتی جس سے اسے ایمان نصیب ہو سکے۔ تم نے دیکھا سلیم! قرآن مشاہدہ کائنات اور مطالعۂ فطرت پر کس قدر زور دیتا ہے وہ کہتا ہے کہ صحیح اور علیٰ وجہ البصیرت ایمان حاصل ہی اس سے ہوتا ہے۔ اس سے ''خدا بے نقاب ہو کر سامنے آ جاتا ہے۔''

میں نے جو یہ کہا ہے کہ اس سے ''خدا بے نقاب ہو کر سامنے آ جاتا ہے'' تو یہ محض شاعری نہیں کی۔ یہ قرآن کی آیت کا ترجمہ ہے۔ ایک آیت کا نہیں۔ متعدد آیات میں یہ حقیقت بیان ہوئی ہے۔ ذرا کان کھول کر سنو اور سوچو کہ قرآن نے چند الفاظ میں کتنی بڑی حقیقت کو سمٹا کر رکھ دیا ہے۔

لِقاءِ رَب

انسانی زندگی کا منتہیٰ کیا ہے؟ ایک خدا پرست انسان کی آخری آرزو کیا ہو سکتی ہے؟ احکامِ خداوندی کی پابندی سے انتہائی مقصود کیا ہے؟ ان سوالات کا ایک ہی جواب ہو سکتا ہے کہ ہر خدا پرست کی آرزو یہی ہوتی ہے کہ اسے خدا مل جائے۔ اس کی اپنے رب سے ملاقات ہو جائے۔ اب دیکھو سلیم! قرآن اس کے لئے کیا طریق بتاتا ہے، سورۂ رعد میں ہے: اَللّٰهُ الَّذِيْ رَفَعَ السَّمٰوٰتِ بِغَيْرِ عَمَدٍ تَرَوْنَهَا۔ اللہ کی ذات وہ ہے جس نے ایسے ایسے عظیم کُرّوں کو فضا کی بلندیوں میں بغیر کسی ایسے ستون کے جو تمہیں نظر آئے، اس حسن و خوبی سے اٹھا رکھا ہے ثُمَّ اسْتَوٰى عَلَى الْعَرْشِ۔ اور وہ خدا اس تمام کائنات کے مرکزی کنٹرول کو اپنے ہاتھ میں رکھے ہے۔ اسی کا نتیجہ ہے کہ: وَسَخَّرَ الشَّمْسَ وَالْقَمَرَ ؕ كُلٌّ يَّجْرِيْ لِاَجَلٍ مُّسَمًّى ؕ۔ اس نے چاند اور

سورج کو اپنے قانون کی زنجیروں میں اس طرح جکڑ رکھا ہے کہ وہ مقرر کردہ راستوں پر ایک وقت معین تک کے لئے بلا چوں و چرا چلے جا رہے ہیں یُدَبِّرُ الْاَمْرَ۔ وہ خدا اپنے اس پروگرام کو حسن تدابیر سے چلائے جا رہا ہے یُفَصِّلُ الْاٰیٰتِ۔ اور اپنی ان آیات کو تمہارے لئے کھول کھول کر بیان کرتا ہے لَعَلَّکُمْ بِلِقَآءِ رَبِّکُمْ تُوْقِنُوْنَ (13:2) تاکہ تم اپنے رب کی ملاقات کا پورا پورا یقین کرو۔ تم نے دیکھا سلیم! قرآن نے یہاں کیا کہا ہے؟ اس نے کہا یہ ہے کہ نظام کائنات کے متعلق یہ تمام تفصیلات اس لئے بیان کی جاتی ہیں کہ تمہیں اس بات کا یقین آ جائے کہ تم اپنے رب سے مل سکتے ہو۔ تمہارا رب تمہارے سامنے آ سکتا ہے۔ اس کا مطلب صاف ہے کہ اگر تم اپنے رب کو اپنے سامنے دیکھنا چاہتے ہو تو اس کا طریقہ یہ ہے کہ تم نظامِ کائنات کا مطالعہ کرو۔ ایک ایک شے پر غور و فکر کرو۔ مختلف تجربات سے اس حقیقت کا انکشاف کرو کہ یہ تمام سلسلۂ کائنات کس محکم قانون کے مطابق چل رہا ہے۔ اس طرح وہ تمام پردے ایک ایک کر کے اٹھ جائیں گے جو خدا کے نظامِ ربوبیت کو سطح بین نگاہوں سے چھپائے رکھتے ہیں اور تم علیٰ وجہ البصیرت دیکھ لو گے کہ اس کا قانون رب العالمینی کس طرح کائنات کی نشو و نما کئے جا رہا ہے۔ اس طرح تم اپنے رب کو اپنے سامنے بے نقاب دیکھ لو گے۔ اس مقام پر یہ سمجھ لینا ضروری ہے کہ جہاں تک خدا کی ذات کا تعلق ہے اسے آنکھوں سے دیکھ لینا تو ایک طرف، اس کا تصور بھی ذہن انسانی میں نہیں آ سکتا۔ لَا تُدْرِکُہُ الْاَبْصَارُ (6:103) انسانی نگاہیں اسے پا ہی نہیں سکتیں۔ اس لئے ''لقاء رب'' کے یہ معنی نہیں کہ خدا کی ذات بے نقاب ہو کر انسان کے سامنے آ سکتی ہے۔ اس کے معنی یہی ہیں کہ فطرت کے مشاہدے سے خدا کا نظام ربوبیت انسان کے سامنے بے نقاب ہو کر آ جاتا ہے اور وہ اس کی رب العالمینی کی کارفرمائیوں اور کرشمہ سازیوں کو اپنی آنکھوں سے دیکھ لیتا ہے۔ بہرحال یہ حقیقت واضح ہے کہ قرآن کی رو سے ''لقاء رب'' کا یقین انہی کو آ سکتا ہے جو فطرت کا مشاہدہ کریں لیکن اس کے لئے بڑی جدوجہد درکار ہوتی ہے۔ پیہم سعی و عمل اور مسلسل تگ و تاز کی ضرورت ہوتی ہے۔ اس کے لئے کبھی ہمالیہ کی چوٹیوں پر چڑھنا پڑتا ہے اور کبھی بحر اٹلانٹک کی گہرائیوں میں

اترنا۔کبھی افریقہ کے تپتے ہوئے صحراؤں میں جھلسنا پڑتا ہے اور کبھی اپنے آپ کو سانپوں سے ڈسوانا۔کبھی ایک پتے کی تحقیق میں مہینوں وقفِ فکر و تدبر رہنا پڑتا ہے اور کبھی قطب شمالی کے برف پوش میدانوں میں ٹھٹھرنا۔کبھی شیروں کے منہ میں ہاتھ دینا پڑتا ہے اور کبھی ایک جرثومہ کی تشریح میں برسوں محو مطالعہ و مشاہدہ۔اور ظاہر ہے یہ کچھ وہی قومیں کرسکتی ہیں جو حاضر و موجود پر مطمئن ہو کر نہ بیٹھ جائیں بلکہ مستقبل کی فکر میں غلطاں و پیچاں رہیں۔

متقی کون ہے

دیکھو سلیم! قرآن نے اس حقیقت کو کس قدر واضح الفاظ میں بیان کیا ہے' ارشاد ہے: **اِنَّ فِی اخْتِلَافِ الَّیْلِ وَالنَّھَارِ وَمَا خَلَقَ اللّٰہُ فِی السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ لَاٰیٰتٍ لِّقَوْمٍ یَّتَّقُوْنَ** (10:6) یقیناً دن اور رات کی گردش اور کائنات کی پستیوں اور بلندیوں میں جو کچھ ہے۔اس کی تخلیق میں تقویٰ شعار قوم کے لئے خدا کی آیات ہیں۔ضمناً تم نے غور کیا سلیم! کہ خدا نے متقیوں کی کیا علامت بتائی ہے؟ اس کے بعد ہے: **اِنَّ الَّذِیْنَ لَا یَرْجُوْنَ لِقَآءَنَا وَرَضُوْا بِالْحَیٰوۃِ الدُّنْیَا** (10:7) اس کے برعکس جو لوگ 'ہماری ملاقات' کی توقع نہیں رکھتے۔جن کے دل میں اس کی آرزو موجزن نہیں ہوتی۔یعنی وہ لوگ جو پیش پا افتادہ مفادِ حال کی قریبی زندگی پر راضی ہو جاتے ہیں۔ **وَاطْمَاَنُّوْا بِھَا**۔ اور جو کچھ سامنے پڑا ہوا اسی پر مطمئن ہو کر بیٹھ جاتے ہیں۔ **وَالَّذِیْنَ ھُمْ عَنْ اٰیٰتِنَا غٰفِلُوْنَ**(10:7)۔ یعنی وہ لوگ جو ہماری ان کائناتی نشانیوں سے بے خبر رہتے ہیں۔ **اُولٰٓئِکَ مَاْوٰھُمُ النَّارُ بِمَا کَانُوْا یَکْسِبُوْنَ** (10:8) یہ وہ لوگ ہیں جو اپنے اعمال کی بدولت جہنم کے عذاب میں مبتلا رہتے ہیں۔ پہلے تو اس بات پر غور کرو سلیم! کہ قرآن کریم نے رضوا بالحیوٰۃ الدنیا اور واطمانوا بھا سے کتنی بڑی حقیقت کی پردہ کشائی کی ہے۔دنیا میں قوموں کی نکبت وزبوں حالی اور عروج و اقبال کا بنیادی راز کیا ہے؟ کیا یہی نہیں کہ ایسی قومیں جو اس پر شاکر اور قانع ہو کر بیٹھ جائیں جو انہیں آسانی سے میسر آ رہا ہو۔وہ ندرتِ فکر اور قوتِ عمل سے محروم ہو کر ذلت و پستی کے عمیق گڑھوں

میں جا گرتی ہیں اور زندہ قوموں کی صفوں سے کہیں پیچھے رہ جاتی ہیں۔ ان کے برعکس جو قومیں حاضر و موجود پر قانع نہیں رہتیں۔ بلکہ مسلسل محنت و مشقت سے نت نئی ایجادات اور نت نئے انکشافات کرتی رہتی ہیں وہ مصارفِ زندگی میں کہیں آگے نکل جاتی ہیں۔ یہ وہ قومیں ہیں جو خدا کے نظامِ ربوبیت کو اپنے سامنے بے نقاب دیکھنے کے نشہ میں سرشار ہوتی ہیں۔ نتیجہ اس کا یہ ہوتا ہے کہ آسمان ان پر اپنی قوتوں اور برکتوں کے دروازے کھول دیتا ہے۔ زمین اپنے چھپے ہوئے خزانے ان کے حوالے کر دیتی ہے۔ جو قومیں ایسا نہیں کرتیں وہ اس سامانِ ربوبیت سے محروم رہ جاتی ہیں۔

سامانِ ربوبیت سے محرومی

وَالَّذِيْنَ كَفَرُوْا بِاٰيٰتِ اللّٰهِ وَلِقَآئِهٖٓ اُولٰٓئِكَ يَئِسُوْا مِنْ رَّحْمَتِيْ ۔ جولوگ ان آیاتِ خداوندی اور ملاقاتِ ربی سے انکار کرتے ہیں وہ خدا کے عطا فرمودہ سامان نشو وارتقاء سے محروم رہ جاتے ہیں۔ **وَاُولٰٓئِكَ لَهُمْ عَذَابٌ اَلِيْمٌ** (29:23) یعنی یہ لوگ ایک دردانگیز عذاب کی زندگی بسر کرتے ہیں۔ تم نے دیکھا سلیم! خدا کے سامانِ رحمت و ربوبیت سے محرومی کو قرآن نے عذابِ الیم کہا ہے۔ اسی کو سورۂ آل عمران اور سورۂ یونس میں عذابِ نار سے تعبیر کیا گیا ہے (10:8; 3:191) یہ آیات پہلے لکھی جا چکی ہیں) ذرا سوچو کہ حجاز کے بے برگ و گیاہ صحرا کے نیچے ذہب سیال (Liquid Gold) یعنی پٹرول کے دریا صدیوں سے بہہ رہے تھے لیکن چونکہ وہ لوگ حاضر و موجود پر مطمئن تھے اس لئے وہ اس بیش بہا نعمتِ خداوندی کی نفع بخشیوں سے محروم تھے۔ نتیجہ اس کا یہ تھا کہ وہ لوگ نانِ شبینہ تک کے لئے دوسروں کی خیرات کے محتاج تھے۔ یہ خدا کا بہت بڑا عذاب تھا [قرآن نے بھوک کو خدا کا عذاب کہا ہے: **فَاَذَاقَهَا اللّٰهُ لِبَاسَ الْجُوْعِ وَالْخَوْفِ** (16:112)] اب اقوامِ مغرب کی نگاہِ خاراشگاف نے ''پگھلے ہوئے سونے'' کے ان دریاؤں کا سراغ پالیا اور اپنی مسلسل کوہ کنی سے انہیں کھینچ کر باہر لے آئے۔ اس سے حجاز کا نقشہ بدل گیا۔ خود

ہمارے خطۂ زمین (پاکستان) میں فطرت نے ممکنات (Potentialities) کی ایک دنیا چھپا رکھی ہے لیکن ہم چونکہ حاضر و موجود پر مطمئن ہیں اور میسرہ (جو کچھ محنت کے بغیر حاصل ہو جائے) پر شاکر اور قانع۔ اس لئے روٹی تک کے لئے بھی دوسروں کے محتاج ہیں۔ یورپ کی بعض قوموں کے پاس چپہ چپہ بھر زمین ہے لیکن وہ اسی زمین سے اتنا کچھ پیدا کرتے ہیں کہ اپنی ضروریات پورا کرنے کے بعد دوسرے ملکوں کو بھی سامانِ زیست بھیجتے ہیں۔ اس لئے کہ وہ فطرت کے مخفی خزانوں کو بے نقاب دیکھنے کے لئے مصروفِ سعی و عمل رہتے ہیں۔ ہم نے اس قانونِ خداوندی سے صدیوں سے اعراض برت رکھا ہے اس لئے ہم پر ہماری معیشت تنگ ہو رہی ہے: **وَمَنْ اَعْرَضَ عَنْ ذِكْرِىْ فَاِنَّ لَهٗ مَعِيْشَةً ضَنْكًا** (20:124) خدا کا کھلا ہوا فیصلہ ہے جو کسی کی خاطر بدل نہیں سکتا۔ حتیٰ کہ مدتِ دراز سے اپنے سمع و بصر سے کام نہ لینے کا نتیجہ یہ ہے کہ ہماری یہ صلاحیتیں ہی سلب ہو چکی ہیں اور ہمارا شمار ان لوگوں میں ہو چکا ہے جن کے متعلق ارشاد ہے کہ: **اُولٰٓئِكَ الَّذِيْنَ طَبَعَ اللّٰهُ عَلٰى قُلُوْبِهِمْ وَسَمْعِهِمْ وَاَبْصَارِهِمْ ۚ وَاُولٰٓئِكَ هُمُ الْغٰفِلُوْنَ** (16:108) یہ وہ لوگ ہیں جن کے قلوب اور سمع و بصر پر مہریں لگ چکی ہیں۔ یہ لوگ ہماری آیات سے بالکل بے خبر ہیں۔

بعض کے نزدیک ''لقاء رب'' سے مراد یہ ہے کہ انسان مرنے کے بعد اپنے اعمال کی جزا و سزا کے لئے خدا کے سامنے جائے گا اگرچہ سیاق و سباق کے پیش نظر یہ مفہوم زیادہ موزوں نہیں لیکن اگر اسے بھی تسلیم کر لیا جائے تو بھی یہ حقیقت اپنی جگہ پر رہتی ہے کہ قرآن کی رو سے اس ''لقاء رب'' کے یقین کے لئے کائنات میں آیات اللہ کا مشاہدہ اور مطالعہ ضروری ہے۔ مرنے کے بعد کی زندگی اور سزا اور جزا ہمارے ایمان کا جزو ہے۔ تم نے دیکھا سلیم! قرآن کس طرح مختلف انداز سے اس حقیقت کو واضح کرتا ہے کہ:

(1) علم وہی علم ہے جس میں انسان اپنے حواس سے پورا پورا کام لے۔

(2) حواس سے کام لینے سے مفہوم یہ ہے کہ انسان اس محسوس کائنات کے اسرار و غوامض سے پردہ کشائی کرے۔ اشیائے فطرت کا وسیع مشاہدہ

کرے۔ قوانینِ فطرت کا گہرا مطالعہ کرے اور مسلسل تجربات اور پیہم تگ وتاز سے خدا کے نظام وقوانین ربوبیت کو اپنے سامنے بے نقاب دیکھتا چلا جائے۔

(3) قومِ مومنین کا یہی شعار ہے۔ گروہِ متقین کا یہی فریضہ ہے' یہی خدا کا ذکر ہے۔ اس فکر سے چھپی ہوئی حقیقتیں ابھر کر سامنے آجاتی ہیں اور انسان کائنات کی ایک ایک شے کے متعلق علیٰ وجہ البصیرت کہہ سکتا ہے کہ: رَبَّنَا مَا خَلَقْتَ هٰذَا بَاطِلًا (3:191)

قرآنی صداقت کی شہادت

اتنا ہی نہیں بلکہ اللہ تعالیٰ نے بتا دیا ہے کہ خود قرآن کی صداقت کی شہادت بھی انہی کائناتی آیات سے ملتی ہے۔ سَنُرِيْهِمْ اٰيٰتِنَا فِي الْاٰفَاقِ وَفِيْٓ اَنْفُسِهِمْ حَتّٰى يَتَبَيَّنَ لَهُمْ اَنَّهُ الْحَقُّ (41:53) ہم انہیں اپنی آیات' عالم آفاق اور عالم انفس میں دکھائیں گے تا آنکہ یہ بات ان کے سامنے ابھر کر آجائے کہ قرآن فی الواقعہ ایک حقیقتِ ثابتہ ہے۔ یعنی زمانے کے پیچ وخم میں لپٹے ہوئے حقائق جوں جوں انسانی علم وکاوش کے ہاتھوں کھلتے جائیں گے۔ قرآن کے دعاوی کے ثبوت' ایک ایک کر کے سامنے آتے جائیں گے۔ جوں جوں زمانہ مشاہدات فطرت اور علومِ سائنس میں آگے بڑھتا جائے گا قرآنی حقائق بے نقاب ہوتے چلے جائیں گے۔ اس آیت میں قرآن نے خارجی کائنات (آفاق) کے ساتھ خود انسانی دنیا (انفس) کو شامل کر کے اس حقیقت کو بھی واضح کر دیا کہ سائنس کا تعلق صرف طبیعات (Physics) ہی سے نہیں بلکہ انسانی زندگی سے متعلق جس قدر علوم ہیں وہ بھی اس کے دائرے کے اندر آجاتے ہیں۔ لیکن ان علوم کے متعلق محض نظری بحثیں مطلوب نہیں بلکہ ان کی تحقیق بھی عملی مشاہدات اور تجارب کی رو سے کی جائے گی۔ تاریخ عمرانیات (Socialogy) اور عملی سائیکلوجی کو اس باب میں خاص اہمیت

حاصل ہوگی۔ طبعی سائنس اور انسانی زندگی سے متعلق علوم کی رو سے جوں جوں حقائق بے نقاب ہوتے جائیں گے۔ قرآن کی پیش کردہ صداقتوں کی دلیلیں سامنے آتی جائیں گی۔ یہ اس لئے کہ: اَوَلَمْ یَکْفِ بِرَبِّكَ اَنَّهٗ عَلٰى كُلِّ شَیْءٍ شَهِیْدٌ (41:53) قرآن اس خدا کی کتاب ہے جس کی نگاہوں سے کوئی راز مستور نہیں۔ اس کے سامنے کائنات کی ہر شے بے نقاب رکھی ہے۔ وہ ہر شے کا ہر وقت مشاہدہ کرتا رہتا ہے اور یہ اس امر کی کافی دلیل ہے کہ وہ ان اشیاء کے متعلق جو کچھ کہے گا ٹھیک ٹھیک کہے گا اس کا بیان علم وحقیقت پر مبنی ہوگا ظن وقیاس پر نہیں۔ اس لئے کہ: اَنْزَلَهُ الَّذِیْ یَعْلَمُ السِّرَّ فِی السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ (25:6) قرآن اس خدا کی طرف سے نازل ہوا ہے جو کائنات کے تمام رموز واسرار سے واقف ہے لیکن جو لوگ کائنات کی ان آیات سے بے خبر رہتے ہیں۔ انہیں درحقیقت ''لقاء رب'' کا یقین نہیں ہوتا۔ اَلَاۤ اِنَّهُمْ فِیْ مِرْیَةٍ مِّنْ لِّقَآءِ رَبِّهِمْ (41:54) حالانکہ انہیں اس کے لئے کہیں دور جانے کی ضرورت نہیں۔ وہ کسی شے کی بھی ریسرچ شروع کردیں تو انہیں خدا کا قانونِ ربوبیت جھلمل جھلمل کرتا نظر آجائے اس لئے کہ: اَلَاۤ اِنَّهٗ بِكُلِّ شَیْءٍ مُّحِیْطٌ (41:54) خدا کا قانونِ ربوبیت ہر شے کو محیط ہے کسی ایک چیز کے ساتھ ہی وابستہ نہیں۔ اس لئے ؎

چشم کو چاہیے ہر رنگ میں وا ہو جانا

تمہیں یاد ہوگا سلیم! میں نے تم سے ایک دفعہ ایک بڑی عمدہ کتاب کا ذکر کیا تھا جس کا نام تھا (The Great Design) اس کتاب کا پلان یہ تھا کہ دنیا کے مختلف علوم کے ائمہ فکر وتحقیق کے پاس یہ سوالنامہ بھیجا گیا کہ آپ نے اپنے شعبۂ علم میں جس قدر تحقیق کی ہے۔ کیا اس کے بعد آپ اس نتیجہ پر پہنچے ہیں کہ یہ نظام کائنات کسی خاص نظم وضبط کے مطابق چل رہا ہے یا یونہی ہنگامی طور پر وجود میں آگیا اور ہنگامی طور پر چلے جا رہا ہے؟ اس سوال کے جو جوابات ان بڑے بڑے سائنسدانوں کی طرف سے موصول ہوئے انہیں بلا تنقید وتبصرہ محولہ صدر کتاب میں یکجا جمع کر دیا گیا ہے۔ ان جوابات کا احاطہ کس قدر وسیع تھا۔ اس کا اندازہ اس سے لگاؤ کہ ایک عالم نباتیات

کے مقالہ کا عنوان تھا ''ایک سبز پتہ'' اور غالباً سر جیمز جینس نے ''ستاروں کی گذرگاہیں'' کے عنوان سے جواب لکھا تھا۔ ان میں ہر محقق اس نتیجہ پر پہنچا تھا کہ ہمیں کائنات کے ذرے ذرے میں کسی علیم وحکیم کے مستحکم اور غیر متبدل نظم ونسق کی کارفرمائیاں دکھائی دیتی ہیں۔ کائناتی نظم وضبط کی یہی وہ کارفرمائیاں ہیں جن کے سامنے ان ائمہ فکر وتحقیق کی نگہ عقیدت قدم قدم پر جھک جاتی ہے لیکن چونکہ ان کے سامنے قرآن نہیں۔ اس لئے وہ اس ہستی کے متعلق صحیح صحیح تصور کا اندازہ نہیں لگا سکتے جو اس نظام کو بایں حسن ورعنائی چلا رہی ہے۔ بایں ہمہ وہ اس کے نظامِ ربوبیت کبریٰ کا مشاہدہ اپنی آنکھوں سے کر رہے ہیں (ان کے لئے اس مقام سے قرآن تک پہنچ جانا کچھ دشوار نہیں بشرطیکہ کوئی ان کے سامنے قرآن کو پیش کرنے والا ہو)۔

علماء کون ھیں؟

یہاں تک تم نے دیکھ لیا سلیم! کہ قرآن کی رو سے علم کی تعریف کیا ہے۔ اس کے بعد اس نقطہ کی وضاحت کی ضرورت ہی نہیں رہتی کہ قرآن کی رو سے عالم کسے کہتے ہیں اور علماء سے مراد کون لوگ ہیں لیکن قرآنِ کریم کا اعجاز دیکھو کہ اس نے اس حقیقت کو بھی خود ہی واضح کر دیا ہے تاکہ اس باب میں کسی قسم کا شبہ یا ابہام نہ رہے۔ قرآن میں ''علماءٴ'' کا لفظ صرف دو مقامات پر آیا ہے۔ ایک جگہ سورۂ شعراء (26:98) میں جہاں علمائے بنی اسرائیل کا ذکر ہے اور دوسری جگہ سورۂ فاطر میں جہاں ''خدا کے بندوں میں سے علماءٴ'' کا ذکر ہے۔ اس تذکرہ کی ابتداء اس طرح ہوتی ہے: **اَلَمْ تَرَ اَنَّ اللّٰہَ اَنْزَلَ مِنَ السَّمَآءِ مَآءً ۚ فَاَخْرَجْنَا بِهٖ ثَمَرٰتٍ مُّخْتَلِفًا اَلْوَانُهَا** ؕ۔ کیا تم نے اس پر غور نہیں کیا کہ اللہ کا قانون کس طرح بادلوں سے مینہ برساتا ہے اور اس سے انواع واقسام کے پھل پیدا ہوتے ہیں، **وَمِنَ الْجِبَالِ جُدَدٌۢ بِيْضٌ وَّحُمْرٌ مُّخْتَلِفٌ اَلْوَانُهَا وَغَرَابِيْبُ سُوْدٌ** ۔ اور پہاڑوں میں کس کس انداز کے سرخ وسفید طبقے ہیں جن کے رنگ اور اقسام مختلف ہیں اور ان میں بعض گہرے سیاہ رنگ کے ہیں، **وَمِنَ النَّاسِ وَالدَّوَآبِّ وَالْاَنْعَامِ مُخْتَلِفٌ اَلْوَانُهٗ كَذٰلِكَ** ؕ۔ اور اسی

طرح انسانوں اور دیگر جانداروں اور مویشیوں کی بھی مختلف اقسام ہیں۔تم نے دیکھا سلیم! کہ ان آیات میں کن امور کا ذکر ہورہا ہے۔کائنات کے مختلف گوشوں کا۔ بساطِ فطرت کے متنوع شعبوں کا۔سائنس کے مختلف علوم کا۔طبیعات (Physics)' نباتیات (Botany)' طبقات الارض (Geology)' حیوانیات (Zoology) اور انسانیات کے تمام شعبے اس کے اندر آجاتے ہیں۔ان علوم وفنون کے تذکرہ کے بعد ہے: اِنَّمَا یَخْشَی اللّٰهَ مِنْ عِبَادِهِ الْعُلَمٰٓؤُا۔ حقیقت یہ ہے کہ خدا کے بندوں میں سے علماء ہی وہ ہیں جن کے دل پر اس کی عظمت اور ہیبت چھا جاتی ہے' اِنَّ اللّٰهَ عَزِیْزٌ غَفُوْرٌ (35:27-28) کیونکہ وہ علیٰ وجہ البصیرت اس حقیقت کا مشاہدہ کر لیتے ہیں کہ خدا کتنی بڑی قوتوں کا مالک ہے اور کس طرح ایسے عظیم کارگہٗ کائنات کو ہر قسم کی تخریب سے محفوظ رکھ کر آگے بڑھائے جا رہا ہے۔تم نے غور کیا سلیم! کہ قرآن نے علماء کا لفظ کن لوگوں کے لئے استعمال کیا ہے؟ انہیں کے لئے جنہیں ہم آج کی اصطلاح میں سائنٹسٹ اور کائناتی مفکر کہتے ہیں۔ وہ لوگ جو کائناتی نظام کا مطالعہ کرتے اور مسلسل مشاہدات و تجربات کے بعد فطرت کی قوتوں کو مسخر کرتے ہیں۔ یہ حقیقت ہے کہ خدا نے فطرت کی تمام قوتیں ہمارے لئے مسخر کر رکھی ہیں (وَسَخَّرَ لَكُمْ مَّا فِي السَّمٰوٰتِ وَمَا فِي الْاَرْضِ) لیکن ان قوتوں کو اپنے کنٹرول میں وہی لا سکتا ہے جو ان قوانین سے واقف ہو جن کے مطابق یہ قوتیں کام کرتی ہیں۔ یہ قوانین فطرت کے مشاہدہ اور مطالعہ اور پیہم تجربات سے معلوم ہوسکتے ہیں جو لوگ ان قوانین کا علم حاصل کرتے ہیں انہیں قرآن علماء کہہ کر پکارتا ہے۔

ہمارے علماء

علماء کی اس قرآنی تعریف (Definition) کے بعد تم غور کرو سلیم! کہ ہمارے ہاں جو حضرات علماء کہلاتے ہیں انہیں علم الفطرت (سائنس کے علوم) سے کس قدر تعلق ہوتا ہے۔ وہ علم الفطرت کے مبادیات تک سے واقف نہیں ہوتے۔ان کا علم نظری مباحث اور لفظی کتر بیونت سے

ایک قدم آگے نہیں جاتا اور یہ نظری مباحث بھی ان مسائل سے متعلق ہوتے ہیں جنہیں نہ کائنات سے کچھ تعلق ہوتا ہے نہ انسان کی عملی زندگی سے کچھ واسطہ۔ ہمارے مذہبی مدارس کا نصاب قریب دس سال پر پھیلا ہوا ہوتا ہے۔ اس دس سال میں سے بیشتر عرصہ منطق۔ فلسفہ۔ معانی۔ بیان۔ ادب۔ نحو وغیرہ کی تحصیل میں صرف ہو جاتا ہے اور منطق وفلسفہ بھی جواب عہدِ پارینہ کی داستان بن چکا ہے۔ اس نصاب میں ہیئت، ہندسہ اور حساب کی بھی دو تین کتابیں ہوتی ہیں لیکن ان میں بھی وہ کچھ پڑھایا جاتا ہے جو زندگی میں کسی کام نہیں آتا اور تو اور (تم حیران ہو گے کہ) ان کے نصاب میں قرآن کریم بھی داخل نہیں۔ تفسیر میں جلالین پڑھا دی جاتی ہے جس میں صرف قرآنی الفاظ کے مرادفات دیئے گئے ہیں اور آخری سال سورۂ بقرہ کی تفسیر بیضاوی۔ بس یہ ہے ان کا نصاب جس کی تکمیل کے بعد انہیں عالم ہونے کی سند مل جاتی ہے۔ اشیائے فطرت کے متعلق ان حضرات کے علم کا اندازہ اس سے لگاؤ کہ جب ہندوستان میں لاؤڈ سپیکر کا استعمال شروع ہوا ہے تو ''علمائے کرام'' سے اس کے جائز اور ناجائز ہونے کے متعلق فتویٰ مانگا گیا۔ اس فتویٰ کے جواب میں جمیعتہ العلماء کے صدر مفتی کفایت اللہ مرحوم نے لکھا کہ:

> جس آلہ کے متعلق سوال کیا گیا وہ اب تک دیکھنے میں نہیں آیا۔ مگر سننے میں آیا ہے کہ وہ ایک ایسا آلہ ہے جسے خطیب یا قاری کے سامنے رکھ دیا جاتا ہے اور وہ اس کی طرف رخ کئے ہوئے قرأت یا خطاب کرتا ہے۔
> پس وہ آلہ آواز کو جذب کر کے اتنی دور نشر کرتا ہے کہ اس کے چوتھائی فاصلہ تک بھی بغیر اس کی مدد کے آواز پہنچانا مشکل ہے۔

(بحوالہ نقیب' 1941-11-10)

اس کے بعد مفتی صاحب نے اس کے جواز کا فتویٰ دے دیا۔ لیکن دارالعلوم (دیوبند) کے بہت بڑے مفتی شفیع محمد صاحب مرحوم نے (جو بعد میں پاکستان تشریف لے آئے) اس کے خلاف ان فتاویٰ کا مجموعہ شائع کیا۔ جس میں ''عباداتِ مقصورہ'' کے لئے اس آلہ کو حرام قرار دیا گیا

تھا*۔انھوں نے اس رسالہ میں (جس کا نام البدائع المفیدہ فی حکم الصنائع الجدیدہ تھا) لکھا تھا کہ انہیں معلوم نہیں تھا کہ اس آلہ کی ماہیت کیا ہے اور وہ کس طرح کام کرتا ہے۔اس کے لئے انھوں نے الیگزینڈر ہائی سکول بھوپال کے سائنس ماسٹر برج نندن لال صاحب سے دریافت فرمایا۔ انہوں نے کہا کہ:

> برقی قوت کی وجہ سے میں تو کم از کم یہ ماننے میں تامل کرتا ہوں کہ اصلی آواز ہے اور اس کا انکار بھی مجھ سے ممکن نہیں کہ ثبوت مشکل ہے۔

چنانچہ اس تحقیق انیق کے بعد مفتی صاحب نے عبادات کے لئے لاؤڈ سپیکر کے استعمال کو حرام قرار دے دیا۔یعنی ماسٹر برج نندن لال صاحب کی بات کی بنیاد پر یہ فیصلہ فرمایا کہ خدا اور رسول ﷺ کا اس باب میں یہ حکم ہے۔تم نے غور کیا سلیم! کہ اشیائے فطرت کی تحقیقات اور علومِ جدیدہ کے متعلق ان حضرات کی معلومات کی کیا کیفیت ہوتی ہے۔ان چیزوں کے متعلق ان کی معلومات کا تو یہ عالم ہوتا ہے لیکن یہ ان کے حرام وحلال ہونے کے متعلق فتوے صادر ضرور کرتے رہتے ہیں اور اب پاکستان میں معاملہ فتاویٰ کی حد سے بڑھ کر قانون سازی تک پہنچ گیا ہے۔مثلاً اگر اب یہ معاملہ حکومت کے سامنے آجائے کہ خطبات کے لئے لاؤڈ سپیکر کا استعمال جائز ہے یا ناجائز۔اور اس کے لئے کسی قانون کے وضع کرنے کی ضرورت ہو تو ان حضرات کا مطالبہ ہے کہ یہ قانون یہ حضرات مرتب کریں گے۔یعنی یہ حضرات پہلے (کسی) ماسٹر برج نندن لال صاحب سے دریافت کریں گے کہ لاؤڈ سپیکر ہوتا کیا ہے اور اس کی بہم پہنچائی ہوئی معلومات کی بناء پر اس بات کا فیصلہ کریں گے کہ اس کا استعمال از روئے کتاب وسنت جائز ہے یا ناجائز اور یہ فیصلہ مملکت کے قانون کی حیثیت سے ملک میں نافذ ہوگا۔یہ حضرات سب سے زیادہ زور اس بات پر دیتے ہیں کہ اگر ہم نہ ہوں تو لوگوں کو شریعت کے مسائل کون بتائے۔سو تمہیں معلوم ہونا چاہئے کہ اسلامی مملکت میں شریعت کے مسائل اس مملکت کے قوانین سے الگ کچھ نہیں ہوتے۔لہٰذا ان کے بتانے کے لئے کسی خاص گروہ کی ضرورت ہی نہیں ہوتی۔یہ کام حکومت کا ہوتا ہے نہ کہ مولوی

صاحبان کا۔ جب رسول اللہ ﷺ اور خلافتِ راشدہ کے زمانہ میں اسلامی مملکت قائم تھی تو اس وقت مولویوں کی کوئی جماعت نہ تھی۔ یہ سب بعد کے زمانہ کی پیداوار ہیں۔ اس وقت تو یہ لفظ (مولوی) ہی کبھی سننے میں نہیں آتا تھا۔

ان تصریحات سے تم نے دیکھ لیا ہوگا سلیم! کہ قرآنِ کریم کی رو سے مومنین متقین۔ خدا کا ذکر کرنے والے۔ ''لقاءرب'' کی آرزو اور یقین رکھنے والے وہی ہیں جو کائناتی نظام پر غور و فکر کرتے اور اشیائے فطرت کی تحقیقات (ریسرچ) کے لئے عملی جدوجہد کرتے ہیں۔ اسی کا نام قرآن کی رو سے علم ہے اور اسی علم کے حاملین کو وہ علماء قرار دیتا ہے۔

ایک شبہ کا ازالہ

اس مقام پر تمہارے دل میں یقیناً یہ خیال پیدا ہوگا کہ اس بناء پر تو یورپ کی قومیں صحیح معنوں میں مومن اور متقی ہیں لیکن یہ خیال صحیح نہیں۔ جماعت مومنین اور گروہِ متقین کے لئے علم الفطرت کی تحصیل نہایت ضروری ہے۔ لیکن یہ سمجھنا غلط ہے کہ ہر وہ قوم جو علم الفطرت حاصل کر لے مومن اور متقی ہو جاتی ہے۔ یہ فرق اہم ہونے کے ساتھ ذرا باریک بھی ہے اس لئے اسے غور سے سمجھنے کی ضرورت ہے۔ مومن و متقی وہ ہیں جو تسخیر فطرت کے بعد' فطرت کی قوتوں کو ان قوانین خداوندی کے مطابق صرف کرتے ہیں جو قرآن میں درج ہیں۔ مومن اور متقی ہونے کے لئے یہ دونوں شرطیں ناگزیر ہیں یعنی:

(1) تسخیر فطرت اور

(2) اس کے ماحصل کو قوانینِ خداوندی کے مطابق صرف کرنا۔

اگر کسی قوم میں ان دو شرطوں میں سے کسی ایک شرط کی بھی کمی ہے تو وہ قوم مومن اور متقی نہیں ہوسکتی۔ قرآن ادْخُلُوْا فِي السِّلْمِ كَآفَّةً (2:208) کا حکم دیتا ہے۔ یعنی قرآن کے پورے کے

پورے نظام کو اپنے اوپر واردکرنے کا حکم۔ہم صحیح معنوں میں مومن اور متقی نہیں کیونکہ ہم میں شرطِ اول (تسخیر فطرت) کی کمی ہے۔(اور جب ہم شرطِ اول (تسخیر فطرت) ہی پوری نہیں کرتے تو شرطِ دوم (قوائے فطرت کا قوانین خداوندی کے مطابق صرف کرنے) کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا اوراقوام مغرب مومن اور متقی نہیں کیونکہ ان میں شرطِ دوم کی کمی ہے۔لہٰذا ایمان وتقویٰ کی عملی سطح پر وہ اور ہم دونوں یکساں ہیں لیکن وہ قومیں اس اعتبار سے ہم سے آگے ہیں کہ انہوں نے تسخیر فطرت سے اپنی طبعی زندگی کو خوشگوار بنالیا ہے اور ہم روٹی تک کے لئے ان کے محتاج ہیں۔

قوائے فطرت کو قوانین خداوندی کے مطابق صرف کرنے کے لئے قرآن کے علم کی ضرورت ہے کیونکہ یہ قوانین خداوندی قرآن کے اندر ہیں۔یہی وہ **وَالرّٰسِخُوْنَ فِی الْعِلْمِ** (3:7) ہیں جو قرآن پر علیٰ وجہ البصیرت ایمان رکھتے ہیں اور تمام امور کے فیصلے اسی کے مطابق کرتے ہیں کہ: **مَنْ لَّمْ یَحْکُمْ بِمَآ اَنْزَلَ اللّٰہُ فَاُولٰٓئِکَ ھُمُ الْکٰفِرُوْنَ** (5:44) جو کتاب اللہ کے مطابق فیصلے نہیں کرتے وہ مومن نہیں کافر ہیں۔اس کفر کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ انسانی معاشرہ دولت اور رزق کی فراوانی کے باوجود جہنم بن جاتا ہے (جیسا کہ اس وقت یورپ کا حشر ہورہا ہے) وہ لوگ سائنس کا اس قدر وسیع علم رکھنے کے باوجود انسانی زندگی کے معاملات کا صحیح حل دریافت نہیں کرپاتے۔یعنی اس باب میں ان کا سمع وبصر وفوٴاد انہیں کچھ کام نہیں دے رہا۔قرآن کریم نے ایسی ہی قوموں کے متعلق کہا ہے کہ: **وَلَقَدْ مَکَّنّٰھُمْ فِیْمَآ اِنْ مَّکَّنّٰکُمْ فِیْہِ وَجَعَلْنَا لَھُمْ سَمْعًا وَّاَبْصَارًا وَّاَفْئِدَۃً** ہم نے ان قوموں کو دنیا میں اس قدر تمکن عطا کیا تھا کہ تمہیں بھی ایسا تمکن عطا نہیں کیا۔اس کے ساتھ ہی انہیں سمع وبصر وفوٴاد بھی عطا کیا تھا۔لیکن **فَمَآ اَغْنٰی عَنْھُمْ سَمْعُھُمْ وَلَآ اَبْصَارُھُمْ وَلَآ اَفْئِدَتُھُمْ مِّنْ شَیْءٍ اِذْ کَانُوْا یَجْحَدُوْنَ بِاٰیٰتِ اللّٰہِ** (46:26) لیکن جب انہوں نے ان قوانین خداوندی کی صداقت سے انکار کیا جو رسولوں کی وساطت سے انہیں ملے تھے تو ان کی سمع وبصر وفوٴاد انہیں تباہی سے نہ بچاسکے۔یہ تمام علم ان کے کسی کام نہ آسکا۔اگر یہ لوگ کائنات کی قوتوں اور فطرت کی بخششوں کو قوانین خداوندی کے مطابق صرف کریں تو وہ جہنم جس میں دنیا اس وقت مبتلا ہے اس

جنت میں تبدیل ہو جائے جس کی تلاش میں انسانیت ماری ماری پھر رہی ہے۔ دیکھو سلیم! اس حقیقت کو قرآن کیسے حسین انداز میں بیان کرتا ہے۔ تم سورۂ یونس کی ان آیات کو پھر اپنے سامنے لاؤ۔ جن میں کہا گیا ہے کہ جو لوگ کائنات میں غور و فکر سے خدا کے نظامِ ربوبیت کو اپنے سامنے بے نقاب نہیں دیکھنا چاہتے اور جو کچھ انہیں یونہی میسر آ جاتا ہے۔ اس پر مطمئن ہو کر بیٹھ جاتے ہیں۔ **أُولَٰٓئِكَ مَأْوٰىهُمُ النَّارُ** (10:8) یہ لوگ جہنم میں رہتے ہیں۔ اس کے بعد ہے: **الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ** (10:9) جو لوگ ان کے برعکس آیاتِ خداوندی پر یقین رکھتے ہیں اور اس کے بتائے ہوئے صلاحیت بخش پروگرام پر عمل پیرا ہوتے ہیں۔ **يَهْدِيْهِمْ رَبُّهُمْ بِاِيْمَانِهِمْ** (10:9) ان کا نشو و نما دینے والا ان کے اس ایمان کی بناء پر زندگی کے صحیح نقشوں کی طرف ان کی راہنمائی کر دیتا ہے۔ **تَجْرِيْ مِنْ تَحْتِهِمُ الْاَنْهٰرُ فِيْ جَنّٰتِ النَّعِيْمِ** (10:9) جس کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ وہ خوشگواریوں کے ان باغات میں رہتے ہیں۔ جن کی شادابیوں میں کبھی فرق نہیں آتا۔ **دَعْوٰىهُمْ فِيْهَا سُبْحٰنَكَ اللّٰهُمَّ** (10:10) اس جنتی معاشرہ کو دیکھ کر ان کے لب پر بے ساختہ یہ پکار آ جاتی ہے کہ بارالہا! فی الواقعہ یہ بات تجھ سے بہت بعید تھی کہ تو اس کائنات کو باطل پیدا کر دیتا۔ **وَتَحِيَّتُهُمْ فِيْهَا سَلٰمٌ** (10:10) اور اس معاشرہ میں ان کی ایک دوسرے کے متعلق آرزوئیں بڑی ہی حیات بخش اور سلامتی افروز ہوتی ہیں۔ جن لوگوں نے اس معاشرہ کو قائم کیا وہ مسلسل جدوجہد اور پیہم سعی و عمل سے اس کی حدود کو وسیع سے وسیع تر کرتے جائیں گے۔ تا آنکہ آخرالامر یہ تمام نوعِ انسانی کو محیط ہو جائے گا۔ ہر دیکھنے والا پکار اٹھے گا کہ خدا کا یہ نظامِ ربوبیت کس طرح ہر قسم کی حمد و ستائش کا سزاوار ہے: **وَاٰخِرُ دَعْوٰىهُمْ اَنِ الْحَمْدُ لِلّٰهِ رَبِّ الْعٰلَمِيْنَ** (10:10) یہ نتیجہ ہوتا ہے فطرت کی نعمتوں کو خدا کے قانون کے مطابق صرف اور تقسیم کرنے کا۔

حرفِ آخر

ان تصریحات سے یہ حقیقت تمہارے سامنے آ گئی ہو گی سلیم! کہ اگر ہم اپنے معاشرہ کو قرآنی خطوط پر متشکل کرنا چاہیں تو اس کے لئے ضروری ہو گا کہ ہم اس قسم کے ریسرچ سکالرز اور سائنسدان (Scientists) پیدا کریں جو انفس و آفاق کے ہر شعبے میں قوانین فطرت کے مشاہدات و تجربات سے فطرت کی قوتوں کو مسخر کرتے جائیں اور اس کے ساتھ وہ قوانین خداوندی جو قرآن کے اندر محفوظ ہیں اس طرح عام کئے جائیں کہ فطرت کی ان قوتوں کو ان قوانین کے مطابق تقسیم اور استعمال کرنے میں کوئی دِقت نہ ہو۔ یہی وہ لوگ ہیں جنہیں قرآن کی رو سے علماء کہا جائے گا۔ جب تک ''علم اور علماء'' کے متعلق ہمارا موجودہ تصور نہیں بدلتا خدا تک پہنچنا تو ایک طرف ہم زندہ قوموں کے زمرے میں بھی شامل نہیں ہو سکتے ؎

بآدمے نرسیدی خدا چہ می جوئی

(تو اَبھی آدمی تک نہیں پہنچا۔ خدا کو کیا تلاش کرے گا۔ ترجمہ از سلیم)۔

وفیھا اٰیات لقوم یعقلون